

ہندوستان کے بانکے

عبدالحمید شرر

تحقیق: چودھری محمد نعیم

جمع و ترتیب: تصنیف حیدر، اعجاز عبید

اپنے مضمون ”پابند ادب انفرادیت: دہلی اور لکھنؤ میں وضع داری کی مختصر تاریخ“ (مطبوعہ ’اردو ادب‘ کتاب ۳۵۲) میں لکھنؤ کے بانکوں کے ذکر میں میں نے لکھا تھا کہ بانکوں کے بارے میں کوئی مطبوعہ تحریر مجھے دستیاب نہیں اگرچہ بچپن میں کئی کتابچے اس موضوع پر دیکھے تھے۔ میں نے یہ بھی لکھا تھا کہ شرر نے بانکوں کا ذکر محض ایک خاص انداز کے پاجامے کے بیان میں کیا ہے اور یہ کہ شرر نہ تو وضع داری کے خاص مدح خواں تھے اور نہ بانکوں کے۔ ان کی مشہور کتاب جسے اب ’گذشتہ لکھنؤ‘ کے نام سے جانا جاتا ہے، بانکوں کے دل چسپ قصوں سے عاری ہے جب کہ اور ہر طرح کے متعدد پُر لطف قصے اس میں موجود ہیں۔

اس وقت تک میری نظر سے محمد قمر سلیم کی انتہائی مفید تالیف ’اشاریہ دلگداز‘ جلد اول، نہیں گزری تھی۔ اب اس کے مطالعے سے پتا چلا کہ شرر نے ایک پورا مضمون لکھنؤ کے بانکوں کے بارے میں لکھا تھا جو ’دلگداز‘ (ستمبر ۱۹۱۴ء) میں شائع ہوا تھا، اس کا عنوان تھا ’ہندوستان کے بانکے‘۔ یہ مضمون دراصل ایک ابتدائیہ تحریر تھا کیوں کہ شرر کا اصل موضوع تھا یورپ کے عہدِ وسطیٰ بالخصوص صلیبی جنگوں کے تعلق سے معروف وہ جنگجو افراد جن کو تاریخ میں Knights Templar یا Knights Hospitaler کہہ کر یاد کیا جاتا ہے، چنانچہ پہلے مضمون کے بعد اس سلسلے کے دوسرے مضامین کا عنوان ہے: ’یورپ کے بانکے، نانٹ ٹمپلرز‘۔

شرر کے یہ تمام مضامین ان کے مضامین کے قدیم مجموعوں میں شامل تھے جو نایاب ہیں۔ اب پاکستان میں نئے انتخاب شائع کیے گئے ہیں۔ ان میں سے ایک کا نام ہی ’یورپ کے بانکے‘ ہے۔ اسے ڈاکٹر فاروق عثمان نے مرتب کیا ہے اور بیکن ہاؤس، لاہور نے ۲۰۰۷ء میں شائع کیا ہے۔ وہاں سے لے کر شرر کا مضمون ’ہندوستان کے بانکے‘ یہاں دوبارہ شائع کیا جا رہا ہے تاکہ یہ اہم تحریر ہندوستان میں بھی لوگوں کے سامنے آجائے۔

شرر کے مضمون سے نہ صرف میری بچپن کے قصوں کی یادوں کی تائید ہوتی ہے بلکہ یہ بھی تسلی ہوتی ہے کہ بانکوں اور وضع داری کے متعلق ان کی رائے جو میں نے قائم کی تھی وہ غلط نہ تھی۔ ساتھ ہی کچھ اور دل چسپ باتیں سامنے آتی ہیں۔ یاد رہے کہ یورپ کے نانٹوں کا ذکر اردو میں سب سے پہلے شرر نے کیا تھا اور طنز و مزاح کے ساتھ سرشار کے مد نظر سروانٹے کا عظیم ناول ’ڈان کی ہونے‘ تھا جس کو انھوں نے اردو میں ’خدائی فوجدار‘ کی شکل میں غلط صحیح اور انتہائی مختصر کر کے پیش کیا تھا۔ سرشار کی نظر میں یورپ کے نانٹ تمسخر کے لائق تھے۔ شرر کی نظر میں نانٹ ٹمپلرز نہ صرف دلاور اور جنگجو تھے، وہ اپنی قوم کے محافظ بھی تھے اور ایک طرح کے ٹریجک ہیرو بھی۔ اس نقطہ نظر کی تائید کی خاطر انھوں نے اپنے مضامین میں ان تمام اعتراضات کو یا تو نظر انداز کر دیا یا پھر سرسری ذکر کر کے آگے بڑھ گئے جن سے یورپ کی تاریخیں بھری ہوئی ہیں اور جن کو سروانٹے اور والتیئر نے مزے لے لے کر لکھا ہے۔ خود نانٹ ٹمپلرز کی تاریخ کے کئی باب سیاہ ہیں۔ لیکن شرر کے سامنے کچھ اور تھا جس کا اندازہ اس بات سے ہو جائے گا کہ انھوں نے لکھنؤ کے بانکوں کو اپنے مضمون کی ابتدا ہی میں ’ہمارے یہ قومی سپاہی‘ کہا ہے اور مضمون کے آخر میں وہ لکھتے ہیں:

”اصلی بانکین ملک و قوم کا ایک بہت ہی اعلیٰ درجے کا شریفانہ جوہر تھا، جو مسلمانوں کے سوا آخر ایام میں بہت سے ہندوؤں سے بھی ظاہر ہوا... یہ گروہ مٹنے کے قابل نہ تھا، اور اسے مٹانے کی نہیں بلکہ باضابطہ بنانے کی ضرورت تھی۔“

شرر کا مکمل مضمون آگے ملاحظہ ہو۔ (چودھری محمد نعیم)

انگریزی حکومت سے پہلے جب دہلی کا دربار مغلیہ برقرار تھا، پھر اُس کے بعد لکھنؤ میں جب اودھ کی چند روزہ سلطنت قائم تھی، ہمیں بانکوں کا ایک عجیب و غریب گروہ نظر آتا ہے جن کا انجام یہ ہے کہ اُن کا کہیں پتا نہیں اور آغاز یہ تھا کہ تاریخ سے کہیں سراغ نہیں لگتا کہ یہ گروہ کب پیدا ہوا اور اس کی بنیاد کیوں کر پڑی؟

ہمارے یہ قومی سپاہی جو 'بانکے' کہلاتے تھے اپنی زندگی سپہ گری کی نذر کر دیتے، سوتے جاگتے، اُٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے ہر وقت پورے اسلحہ جنگ سے آراستہ اور اوپچی بنے رہتے۔ ایک رنگی و یک وضعی کو اپنا شعار جانتے اور اس بات کی دھن تھی کہ ہماری ہی بات سب پر بالا رہے۔ باوجودیکہ وہی مروج و متداول اسلحہ سب کے پاس ہوتے مگر ساتھ ہی ہر ایک اپنی کوئی خاص دھج اور اپنا کوئی مخصوص بانا رکھتا جس کو مرتے دم تک نہ چھوڑتا اور اس کی تاب نہ لا سکتا کہ اس دھج شعار کو کوئی اور بھی اختیار کرے۔

پہلے پہل ان بانکوں کا نام محمد شاہ رنگیلے کے زمانے میں سُنا جاتا ہے۔ پُرانے راوی اور یادگار زمانہ بڈھے بیان کرتے ہیں کہ محمد شاہ کے پاس ایک لشکر بانکوں کا تھا اور ایک زنانوں کا اور نادر شاہ کے مقابلے میں اگر کچھ لڑے تو یہی لوگ لڑے۔ بانکے جانیں دینے پر تُلے ہوئے تھے اور زنانے عورتوں کی طرح 'اوبی' کہہ کے تلوار مارتے تھے۔ اُس زمانے کے بعد جب دہلی اپنے باکمالوں اور ہر فن کے استادوں کی قدر کرنے کے قابل نہ رہی تو اُن کا رُخ اودھ کی طرف پھر گیا اور قدردانی کی امید میں ہر ادنیٰ و اعلا دہلی چھوڑ چھوڑ کے یہاں آنے لگا۔ اب یہ لوگ فیض آباد اور لکھنؤ کی سڑکوں پر ٹہلتے نظر آتے تھے۔ مگر یہاں زنانے سپہ گروں کا تو پتا نہ تھا، ہاں بانکے تھے جن کی روز بروز کثرت ہوتی جاتی تھی۔

بادی النظر میں خیال ہوتا ہے کہ تمام بانکوں کی ایک سی وضع ہو گئی، مگر ایسا نہ تھا، ان میں سے ہر فرد اپنے بانکین کو ایک نئے عنوان سے اور نئی شان سے ظاہر کرتا۔ پہلے عام وضع یہ تھی کہ سر کو چندیا سے گڈی تک مُنڈاتے اور دونوں طرف کے پٹوں میں سے ایک تو کانوں تک رہتا اور دوسرا شانوں تک لٹکتا، بلکہ کبھی اس کی چوٹی گوندھ کے ایک طرف سینے پر ڈال لی جاتی۔ اس کے بعد جدتیں ہونا شروع ہوئیں اور ہر بانکے نے اپنے لیے کوئی نئی دھج ایجاد کی۔ کسی صاحب نے ایک طرف کی مونچھ اس قدر بڑھائی کہ وہ بڑھتے بڑھتے چوٹی سے بوس و کنار کرنے لگی۔ کسی صاحب نے پگڑی کا شملہ بجائے پیٹھ کے ایک طرف شانے پر ڈال لیا۔ کسی صاحب نے پانچامے کا ایک پانچا اس قدر نیچا کر لیا کہ زمین بوس ہو رہا ہے اور دوسرا پانچا اس قدر اُٹنگا رکھا کہ آدھی پنڈلی کھلی ہوئی ہے۔ کسی صاحب نے لوہے کی ایک بیڑی پاؤں میں ڈال کے اُس کی زنجیر کمر میں اٹکا لی اور اُسے کھڑکاتے ہوئے پھرنے لگے۔ کسی صاحب نے یہ ترقی کی کہ بہت سے روپوں میں دونوں طرف کُٹڑے لگا کے اور اُنہیں باہم جوڑ کے ایک نئی قطع کی نقرئی زنجیر بنائی۔ پھر اُس کے دونوں سروں پر چاندی کے دو حلقے لگائے۔ ایک حلقے کو ایک طرف کے پاؤں میں ڈال لیا اور دوسرے کو اُسی طرف کے بازو میں پہن کے شانے پر اٹکا لیا اور نہایت غرور و تمکنت کے ساتھ زنجیر بجاتے ہوئے گھر سے نکل کھڑے ہوئے۔ غرض جتنے بانکے تھے اُتنی ہی دھجیں تھیں۔ اسی قسم کی جدت طرازیں اسلحہ کے متعلق تھیں۔ کوئی صاحب دو دھارا تیغ ہاتھ میں رکھتے جو ہر وقت برہنہ اور ہوا سے لڑتا رہتا۔ کوئی صاحب رستم و نریمان کے زمانے کا وزنی سلاح گرز لیے پھرتے۔ کوئی صاحب تیر کاندھے پر رکھے نظر آتے اور ساری دنیا کو اپنی نظر میں بیچ خیال کرتے۔

ان لوگوں کے باہر نکلنے کی یہ شان تھی کہ تبختر اور نخوت کے ٹھاٹھ سے اپنے اوپر ناز کرتے ہوئے چلتے۔ ہر ایک پر کڑوے تیور ڈالتے اور اگر کہیں کسی کو دیکھ لیتے کہ اُنہیں کا بانا اور شعار اُس نے بھی اختیار کر لیا ہے تو بلا تامل ٹوک بیٹھتے اور کہتے "اُئیے ہم سے آپ سے دو دو ہاتھ ہو جائیں۔ یہ بانا یا تو ہمارا ہی ہو گا یا آپ ہی کا ہو گا۔"

اس سے زیادہ قیامت یہ تھی کہ ان لوگوں کا تبختر، ان کا فخر و ناز، ان کی چال ڈھال، ان کی وضع قطع اور ان کے مخصوص شعار سب چیزوں کی یہ حالت تھی کہ دیکھتے ہی انسان کو بے اختیار ہنسی آ جائے، مگر کس کی مجال تھی کہ اُن کی طرف دیکھ کے مُسکرا بھی دے۔ انہوں نے کسی کو جھوٹوں بھی مسکراتے دیکھا اور قرابنچے پر ہاتھ جا پڑا۔ پھر اُس وقت اگر کوئی ایسے ہی بُردبار بانکے ہوئے تو اُسے خوشامد درآمد کر کے عفوِ تقصیر کا موقع بھی ملا ورنہ بلا تامل قرابنچہ بھونک دیا اور اپنی راہ لی۔

یہ مجال نہ تھی کہ کوئی بانکے صاحب کسی صحبت میں ہوں اور کوئی اُن کی بات ٹالنا یا اُن پر اعتراض کرے۔ نتیجہ یہ تھا کہ

بڑھ بڑھ کے باتیں بناتے، لاف زنی کرتے، بے پر کی اور جھوٹ کے پُل باندھتے مگر کسی کو جرأت نہ ہو سکتی کہ چوں کرے یا مسکرائے۔ مشہور ہے کہ ایک بانکے صاحب چند مہذب لوگوں کی محفل میں کہنے لگے ”اجی فالں راجہ کی گڑھی پر جب ہم نے سو آدمیوں سے دھاوا کیا ہے تو ہر سپاہی کے گلے میں پانچ پانچ ڈھولیں تھیں اور ہمارے سو آدمی پانسو ڈھولیں بجاتے ہوئے جا پڑے۔“

اور تو کس کی مجال تھی کہ ایک بانکے کی زبان پکڑے؟ سب خاموش بیٹھے رہے مگر ایک نوجوان کی زبان سے نکل گیا: ”خیر پانچ ڈھولیں تو گلے میں ڈال کے شاید راون کے سر کی طرح چاروں طرف پھیلا لی ہوں مگر ہر آدمی پانچ پانچ ڈھولیں کن ہاتھوں سے بجاتا ہو گا؟“

یہ سنتے ہی بانکے حضرت آگ بگولا ہو گئے۔ تلوار سیدھی کی اور ڈانٹ کے کہا ”ایں! یہ ہم پر اعتراض! تو ہم جھوٹے ہوئے؟“

سب نے کہا

”آپ کو جو جھوٹا کہے وہ خود جھوٹا۔ یہ لڑکا بزرگوں کی کیا قدر جانے؟ آپ اپنی طرف دیکھیں۔“

دھن کے اس قدر پکے تھے کہ کسی کا دباؤ ہی نہ مانتے۔ یہاں تک کہ بعض بعض بہت اعلا درجے کے بانکے، بادشاہوں اور حکام وقت کی بھی پروا نہ کرتے تھے۔ نواب سعادت علی خاں کے زمانے میں دہلی کے آئے ہوئے مشہور بانکوں میں ایک میرزا جہانگیر بیگ تھے۔ اُن کا نوعمری کا زمانہ تھا۔ باپ نواب صاحب کے درباریوں میں تھے۔ جہانگیر بیگ کی جھگڑا و فساد کی خبر کئی بار سُن کے نواب سعادت علی خاں خاموش ہو رہے، مگر آخر کار ایک دن بہت برہم ہوئے اور اُن کے والد سے کہا ”آپ کے صاحبزادے کی شورہ پشتیاں حد سے گزرتی جاتی ہیں اور انہوں نے سارے شہر میں اُدھم مچا رکھا ہے۔ اُن سے کہہ دیجیے گا کہ اپنے اس بانکین پر نہ بھولیں۔ ناک نہ کٹوا لی ہو تو میں سعادت علی خاں نہیں۔“

باپ خود ہی بیٹے کی حرکتوں سے عاجز تھے۔ عرض کیا۔

”خداوند! اُس کی شرارتوں سے غلام کا ناک میں دم ہے۔ ہزار سمجھاتا ہوں نہیں مانتا۔ شاید حضور کی یہ دھمکی سُن کے سیدھا ہو جائے۔“

یہ کہہ کے گھر آئے اور بی بی سے کہا ”تمہارے صاحبزادے کے ہاتھوں زندگی سے عاجز آ گیا ہوں۔ دیکھیے اس نالائق کی حرکتوں سے ہماری کیا گت بنتی ہے؟ جی چاہتا ہے نوکری چھوڑ دوں اور کسی طرف منہ چھپاکے نکل جاؤں۔“

بی بی نے کہا ”اے تو کچھ کہو گے بھی؟ آخر ہوا کیا؟“

کہا ”ہوا یہ کہ آج نواب صاحب بہت ہی برہم بیٹھے تھے۔ میری صورت دیکھتے ہی کہنے لگے اپنے بیٹے سے کہہ دینا کہ میں سعادت علی خاں نہیں جو ناک نہ کٹوا لی ہو۔“ اتنے میں مرزا جہانگیر بیگ جو کہیں باہر گئے ہوئے تھے، گھر میں آ گئے۔ ماں نے کہا ”بیٹا خدا کے لیے اپنی یہ حرکتیں چھوڑ دو، تمہارے ابا بہت ہی پریشان ہیں۔“

مرزا صاحب نے کہا ”میرا کچھ قصور بھی بتائیے گا یا خالی الزام ہی دیجیے گا۔“

باپ نے کہا ”کوئی ایک قصور ہو تو بتایا جائے؟ تم نے وہ سر اُٹھا رکھا ہے کہ سارے شہر میں آفت مچ گئی۔ آج نواب صاحب کہتے تھے کہ اپنے صاحبزادے سے کہہ دینا میں سعادت علی خاں نہیں جو ناک نہ کٹوا لی ہو۔“

باپ کی زبان سے اتنا سنتے ہی مرزا صاحب کو جو طیش آیا تو کمر سے خنجر نکال لی اور خود ہی اپنی ناک کاٹ کے باپ کی طرف پھینک دی اور بولے ”بس اسی ناک کاٹنے کی نواب صاحب دھمکی دیتے ہیں؟ لیجیے یہ ناک لے جا کے انہیں دے دیجیے۔“

یہ دیکھتے ہی ماں باپ دونوں سنائے میں آ گئے اور جب باپ نے بیٹے کی ناک نذر کے طریقے سے نواب صاحب کے سامنے پیش کی اور واقعہ بیان کیا تو وہ بھی دم بخود رہ گئے اور معذرت کرنے لگے کہ ”بھئی میرا یہ منشا نہ تھا، میں تو سمجھا تھا کہ اس دھمکی سے انہیں تنبیہ ہو جائے گی۔“

باپ نے کہا ”خداوند! ایسا نالائق اور اپنی دھن کا پکا ہے کہ کسی کا زور ہی نہیں چلتا۔ جسے نہ جان کا خیال ہو نہ عزت آبرو کا، اُس کے منہ کون لگے؟“

اس واقعے کے بعد مرزا جہانگیر بیگ نکٹے مشہور ہو گئے۔ اور اب اتنے بڑے زبردست اور سند یافتہ بانکے تھے کہ شہر کے سارے بانکے اُن سے دیتے تھے۔ سینکڑوں بانکے ان کے شاگرد ان کے حکم کے تابع، بے عذر فرماں بردار اور اُن کے جتھے میں بھی شریک تھے جن سے سارا شہر کانپتا تھا۔ یہاں تک کہ ایک مشہور بھانڈ نے نواب سعادت علی خاں کے سامنے کوئی گستاخانہ نقل کی تو اُنہوں نے ہنس کے کہا ”میرے سامنے تو جو چاہتا ہے کہہ جاتا ہے جب جانوں کہ تو مرزا جہانگیر بیگ نکٹے پر کوئی فقرہ تیز کرے۔“

اس نے عرض کیا ”خداوند کہہ تو جاؤں گا مگر حضور بچا لینے کا اقرار فرمائیں۔“

نواب نے وعدہ کیا اور اُس کے دوچار روز بعد ایک دن مرزا جہانگیر بیگ پورے اسلحہ لگائے دریا کنارے اپنی نشست میں مونڈھے پر بیٹھے تھے۔ پچاس ساٹھ شاگردوں اور بانکوں کا مجمع گرد تھا کہ وہ بھانڈا ایک لنگ باندھے ہوئے دریا سے نکل کے آیا۔ اس کی صورت دیکھتے ہی مرزا جہانگیر نے کہا ”اخاب تم ہو؟ اچھے تو رہے۔“

یہ سنتے ہی وہ آداب بجا لایا۔ سامنے آ کے زمین پر بیٹھ گیا اور اُن کے چہرے کی طرف ہاتھ اٹھا کے کہنے لگا :
'خداوند اتنی کٹ گئی اور جو یہ رہی ہے یہ بھی کٹ جائے گی'

ایک بھانڈ کی زبان سے یہ جملہ سنتے ہی مرزا جہانگیر کو ایسا طیش آیا کہ مارے غصے کے اس قدر کانپے کہ ہاتھ سے تلوار چھوٹ گئی اور وہ بے تحاشا بھاگ کے پانی میں کود پڑا، دو چار غوطے لگائے اور پانی ہی پانی میں کسی طرف نکل گیا۔ اب مرزا صاحب کے جتھے کے لوگ ڈھونڈتے پھرتے تھے کہ کہیں ملے تو حرام زادے کو مار ڈالیں۔ آخر ایک دن نواب سعادت علی خان نے اُسے مرزا جہانگیر بیگ کے قدموں پر گرا کے کہا ”بھئی اس کی بات کا بُرا ماننا ہی کیا؟ یہ تو مجھے بھی کہہ جاتا ہے۔“ اور اس کا قصور معاف کروا دیا۔

شاہی کے آخری زمانے تک ان لوگوں کا بڑا زور رہا۔ اور بانکین میں کچھ ایسی امتیاز کی صورتیں تھیں کہ اکثر شریف زادے خصوصاً وہ جنہیں سپہ گری کا شوق ہوتا، بانکے بن جاتے اور اپنی کوئی خاص دھج بنا لیتے۔ اگر قاعدے اور سلطنت کی قوت کے ساتھ کوئی ایسا گروہ موجود ہوتا تو دراصل یہ لوگ سلطنت کے قوت بازو ثابت ہوتے اور اُن کی ذات سے قوم و ملک کو بڑا نفع پہنچتا۔ لیکن بدنصیبی سے جن دنوں بانکوں کا گروہ پیدا ہوا تھا۔ دہلی و لکھنؤ کی دونوں سلطنتیں نہایت کمزور اور عجیب غیر منتظم حالت میں تھیں اور یہی بانکے جو مایہ ناز اور ذریعہ عروج ہو سکتے تھے اُن کے لیے باعث زوال بن گئے۔ سلطنت اُن کو دبا نہ سکتی تھی اور اُن کی خود سری و سرکشی سے آنے دن شہر کے گلی کوچوں میں خانہ جنگیاں ہوا کرتی تھیں۔ جن لوگوں کو اُن کے ہاتھ سے آزار پہنچتا سلطنت اُن کی داد رسی نہ کر سکتی اور انہوں نے اپنے ایسے ایسے جتھے بنا لیے تھے کہ بڑے بڑے رسال داروں کو بھی اُن سے دب جانا پڑتا تھا۔

ان میں باوجود احمقانہ تفاخر و غرور کے یہ خاص بات تھی کہ ہندوستان کے بلکہ شاید ساری اگلی دنیا کے کج خانوں میں سپہ گروں کے خلاف یہ نہایت ہی مہذب سپاہی ہے۔ اور اُن لوازم اخلاق کو جو دو مہذب و شائستہ دوستوں میں ہوا کرتے ہیں اپنے حریف کے ساتھ برتتے تھے۔ کسی ادنیٰ درجے کے سپاہی سے لڑنا اور مقابلہ کرنا اپنا شان و وضع کے خلاف اور موجب توہین تصور کرتے۔ شریف حریف ہی سے لڑتے اور پھر اُس کے ساتھ شرفا کا سا برتاؤ بھی کرتے۔ اکثر یہ بھی ہوا کہ دو بانکوں میں لڑائی ہوئی اور لڑائی میں بھی دونوں کو اس کا لحاظ ہے کہ کوئی بات حریف کی عزت و حرمت یا مرضی و شان کے خلاف نہ ہونے پائے۔ ایک کہتا ”پہلے آپ وار کریں۔“ دوسرا کہتا ”نہیں پہلے آپ۔“ یہ نہیں ہو سکتا۔“ پھر جب حریف کمزور ثابت ہو جاتا تو فوراً لڑائی سے ہاتھ روک لیتے اور پھر اُس کے حق میں اُن سے زیادہ کوئی مہربان نہ تھے۔ دنیا میں اس کے نہایت ہی سچے ہمدرد یہ تھے۔ اگر مغلوب دشمن اپنے پاؤں سے جانے کے قابل نہ ہوتا تو اُس کے گھر تک اُس کی مشایعت کرتے۔ راستے میں بیسیوں جگہ یہ واقعہ پیش آتا کہ یہ کہتے آپ آگے چلیے۔ اور وہ کہتا آپ آگے چلیے۔ بعض بانکوں کے واقعات میں مشہور ہے کہ لڑائی کے بعد زخمی حریف کو اُس کے گھر تک پہنچانے گئے اور وہاں سے چلے تو حریف دوست نے کہا ”تو کیا آپ تنہا جائیں گے؟ یہ نہیں ہو سکتا۔“ وہ انہیں ان کے گھر تک پہنچانے کو آیا اور جب وہ پہنچا کے چلا تو اخلاقاً پھر اُس کے ساتھ بولیتے۔ اسی اخلاق میں صبح ہو گئی کہ جب یہ اُس کے گھر پہنچتے ہیں تو وہ ان کی مشایعت کے لیے ان کے ساتھ ہو لیتا ہے۔ اور جب وہ ان کے گھر پہنچتا ہے تو یہ اُس کی مشایعت کے لیے اُس کے ساتھ ہو لیتے ہیں۔

اکثر بانکوں کی یہ وضع تھی کہ شربتی کے باریک انگرکھے کے سوا کوئی کپڑا نہ پہنتے اور لڑائی میں زرہ پہننا یا ڈھال سے کام لینا بُزدلی اور نامردی خیال کرتے۔ نتیجہ یہ ہوتا کہ حریف کا سامنا ہوتا تو اُس کی تلوار کو گویا ننگے سینے پر لیتے۔ چرکے پر چرکے کھاتے اور اُف نہ کرتے۔ اسی طرح چلوں کا جاڑا اُسی شربتی کے انگرکھے پر گزرتا اور مجال کیا کہ کانپیں، تھرتھرائیں یا زبان سے ’سو! سو! کی آواز نکلتے۔ بعض اس پر بھی یہ قیامت کرتے کہ اُس کے باریک لباس پر باسی پانی چھڑکواتے اور جوں جوں سردی معلوم ہوتی اور اکڑتے جاتے۔

ان کی آخر زمانے کی عام وضع دکھانے کے لیے ہم ایک بانکے صاحب کی صورت اپنے ناظرین کو دکھائے دیتے ہیں جنہیں خوش نصیبی سے ہم نے اپنے بچپن میں غدر کے تیرہ چودہ برس بعد مٹیا برج (کلکتہ) میں اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ یہ صاحب عہد شاہی کے باقیات الصالحات میں سے تھے۔ غدر میں جا بجا لڑے۔ جب انگریزوں کا تسلط ہو گیا تو ہتھیار پھینک کے بہت دنوں تک ادھر ادھر چھپتے پھرے اور آخر جب پریشان ہوئے تو کلکتہ میں آئے کہ واجد علی شاہ کے ظلِ عاطفت میں باقی ماندہ زندگی بسر کر دیں۔ اُن سے اگرچہ ہتھیار چھین گئے تھے مگر وضع نہیں بدلی تھی۔ یہ ایک کشیدہ قامت ڈبلے چہرے آدمی تھے۔ پیشانی سے گدی تک بیچ میں سر مُنڈا ہوا تھا۔ ایک پٹا بڑا تھا اور ایک چھوٹا اور دونوں دو پلڑی ٹوپی اور پگڑی کے نیچے نکلے ہوئے تھے۔ ڈاڑھی چڑھی تھی اور مونچھیں ہمیشہ کھڑی رہتیں۔ بدن میں کھنچا ہوا چُست نیچے دامنوں کا

انگرکھا تھا۔ ٹانگوں میں عورتوں کا سا لمبے پائنچوں کا کلیوں دار پاجامہ۔ پیٹھ پر مثلث وضع کا رو مال اوڑھے رہتے۔ ہاتھ میں ہر وقت ایک پنکھا رہتا اور لکھنؤ کا خورد نو کا جوتا پاؤں میں تھا، مگر یک رنگی کا سب سے زیادہ نمایاں ثبوت یہ تھا کہ یہ سب کپڑے چھینٹ کے تھے جس چھینٹ کا انگرکھا تھا اُسی کی ٹوپی اُسی کی پگڑی تھی۔ اسی کا رو مال پیٹھ پر، اُسی کا پانجامہ تھا، اُسی کا پنکھا تھا اور وہی چھینٹ جوتے کے بیرونی رُخ پر بھی منڈھی ہوئی تھی۔ ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ سارے بانکوں کی یہی وضع تھی، ممکن ہے کہ انہیں بزرگ نے خاص اپنی یہ دھج رکھی ہو۔

مثیا برج میں چند روز یہ اسی وضع میں رہے۔ جدھر سے نکل جاتے انگلیاں اُٹھنے لگتیں اور لوگ گھبرا گھبرا کے ان کی صورت دیکھتے اور ہنستے۔ اب انگریزوں میں یہ تو مجال نہ تھی کہ کسی کو ہنسنے پر ٹوکیں۔ وہ جو مثل مشہور بے کتا و بی بلی چوبوں سے کان کٹاتی رہے۔ یہ بے چارے خود ہی نظر نیچی کر لیتے اور کوئی چاہے کچھ کہے یا کچھ کرے یہ اپنی آنکھیں جھکائے چلے جاتے، مگر باوجود اس کے اکڑ اور تیوروں کا وہی حال تھا۔ کسی محفل میں بیٹھ کے باتیں کرتے تو معلوم ہوتا کہ ساری صحبت پر حکومت کر رہے ہیں اور کسی کی اپنے سامنے کچھ ہستی نہیں سمجھتے۔

جب واجد علی شاہ کا سامنا ہوا تو بادشاہ نے کہا ”بھئی چھوٹے خان... اور یہی ان بانکے صاحب کا نام تھا...“۔ اب زمانہ بدل گیا، نہ وہ ہم رہے نہ وہ تم رہے، اس لیے جس طرح ہماری وضع بدل گئی ایسے ہی اب تم بھی اپنی وضع بدل دو۔“ عرض کیا ”خداوند! اب تھوڑی سی رہ گئی ہے اسے اسی وضع میں گزر جانے دیجیے۔“

بادشاہ نے کہا ”نہیں تمہیں میرے سر کی قسم اب وضع بدل دو اور سمجھو کہ جو کچھ ہونا تھا سو ہو چکا۔“ یہ کہہ کے بادشاہ نے ایک خواص کو اشارہ کیا جس نے ایک دوشالہ لا کے اڑھا دیا۔ جب دوسری وضع کا کپڑا اڑھا ہی دیا گیا تو مجبور ہو گئے۔ آداب بجا لا کے وہ دوشالہ لے لیا اور گھر آئے، پھر اس کے بعد جو گھر سے نکلے تو سفید کپڑے پہنے ہوئے تھے۔

چند سال بعد اُنہوں نے مثیا برج میں انتقال کیا اور میں سمجھتا ہوں کہ ان کی موت پر نہیں بلکہ اُن کی وضع بدلنے ہی پر پُرانے بانکوں کا خاتمہ ہو گیا۔

اس میں شک نہیں کہ جب شریف زادوں اور عام سپہ گروں میں بانکے بننے کا شوق بڑھا، ادنیٰ و اعلا ہر گروہ میں بانکے پیدا ہونے لگے اور شہر میں بانکوں کی کثرت ہوئی تو بہت سے ایسے بانکے بھی نظر آنے لگے جن میں نہ ویسی شرافت تھی اور نہ ویسی شجاعت اور جب موقع پڑتا اُن کی کمزوری کھل جاتی۔ لیکن اصلی بانکین ملک و قوم کا ایک بہت ہی اعلا درجے کا شریفانہ جوہر تھا جو مسلمانوں کے سوا آخر ایام میں بہت سے ہندوؤں سے بھی ظاہر ہوا۔ اس اعلا جوہر کا ہندوستان سے مٹ جانا اس کی تاریخ کا ایک حسرت ناک ورق ہے۔

ہمیں اس سے انکار نہیں ہے کہ بانکوں کی کثرت اور ہتھیاروں کے بے روک بے ضرورت استعمال نے ملک کے امن و امان میں فرق ڈال دیا تھا۔ شہر میں روز خانہ جنگیاں ہوتیں اور اکثر رہ گزروں پر لاشیں پھڑکتی نظر آتیں۔ یہی نہیں بلکہ روز بروز ثابت ہوتا جاتا کہ بانکے سپہ گر خانہ جنگیوں اور باہمی جدال و قتال میں جس قدر زیادہ باکمال اور شجاع ہیں اُسی قدر غنیم کے حملے روکنے اور میدانِ جنگ میں اپنے ابنائے وطن کے ساتھ شریک ہونے میں ناقص و ناکارہ ہیں، لیکن اس پر بھی ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ گروہ مٹنے کے قابل نہ تھا اور مٹانے کی نہیں بلکہ باضابطہ بنانے کی ضرورت تھی۔

یورپ میں بھی ہمیں قدیم ایام میں بانکوں کا ایک گروہ نظر آتا ہے جو ’نائٹ‘ کہلاتے تھے۔ موجودہ یورپ کے اعلا درباروں سے فی الحال معزز لوگوں کو جو نائٹ کا خطاب ملا کرتا ہے یہ اُسی پُرانے فنا شدہ گروہ کی یادگار ہے۔ ہم ان مغرب کے بانکوں کا حال آئندہ نمبر میں بیان کریں گے۔

ماخذ

’یورپ کے بانکے‘ مرتبہ فاروق عثمان، لاہور، ۲۰۰۷ء۔

عبدالحمید شرر: ’یورپ کے بانکے‘ مرتبہ ڈاکٹر فاروق عثمان، لاہور، بیکن ہاؤس، ۲۰۰۷ء، ص ۸۲۔ ۷۶۔

(مطبوعہ رسالہ ’دلگداز‘، ستمبر ۱۹۱۴ء)

اس مضمون کے آغاز میں اردو ادب کے ایڈیٹر کی جانب سے یہ نوٹ لکھا گیا ہے۔

شرر کا یہ دل چسپ اور نایاب مضمون ہمیں چودھری محمد نعیم کی جانب سے ان کے وضاحتی نوٹ کے ساتھ عنایت ہوا ہے جسے ہم ان کے شکریے کے ساتھ ’اردو ادب‘ کے صفحات پر آراستہ کر رہے ہیں۔ مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو چودھری محمد نعیم کا وضاحتی نوٹ جو مضمون سے پہلے یہاں درج ہے۔

(ایڈیٹر)

مشمولہ اردو ادب، شمارہ اکتوبر تا دسمبر ۲۰۱۱

بشکریہ اطہر فاروقی، جنرل سکرٹری، انجمن ترقی اردو (ہند)

(نوٹ: یہ مکمل مضمون اردو ادب، دہلی میں شائع ہوا تھا اور اسے تصنیف حیدر نے اپنے بلاگ ادبی دنیا پر شائع کیا تھا، جہاں سے یہ کاپی کیا گیا۔)

<https://adbiiduniya.blogspot.com/2015/12/hindustan-ke-baanke-by-abdul-halim-sharar.html>

تدوین اور ای بک کی تشکیل: اعجاز عبید